



احمد ندیم قاسمی

(1916 – 2006)

احمد ندیم قاسمی ضلع شاہ پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں ہی میں ہوئی۔ 1935 میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں ملازمت کرتے رہے۔ 1942 میں ”تہذیب نسواں“ اور ”پھول“ کے ایڈیٹر رہے۔ وہ ”ادب لطیف“ اور ”نقوش“ کے بھی مدیر رہے۔ انھوں نے ”فنون“ کے نام سے خود اپنا بھی ایک سہ ماہی جریدہ جاری کیا جس کے وہ آخر وقت تک مدیر رہے۔

احمد ندیم قاسمی ادب میں کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ایک معروف ادبی صحافی بھی۔ ان کے نصف درجن کے قریب شعری مجموعے اور ایک درجن سے زیادہ افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ ادبی مضامین اور اخباری کالم نویسی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، انھوں نے سب سے زیادہ شہرت اپنے افسانوں کی وجہ سے پائی۔ پنجاب کی دیہی زندگی اور عام انسانوں کے مسائل کی عکاسی کا وہ غیر معمولی سلیقہ رکھتے تھے۔ اسی لیے عام پڑھنے والوں میں ان کی کہانیاں بہت مقبول تھیں۔

احمد ندیم قاسمی کا تعلق ایک روایتی مذہبی خاندان سے تھا۔ ترقی پسند تحریک سے بھی انھوں نے اپنی ترجیحات کے ساتھ رابطہ قائم رکھا۔ ان کے اس ذہنی رویہ کے اثرات ان کی تخلیقات میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔

سُلطان



5019CH06

دادا کے بائیں پنجے میں سلطان کی کھوپڑی تھی اور دائیں میں لاٹھی جو پٹری کے پکے فرش پر ٹھن ٹھن بجے جا رہی تھی۔ سلطان ذرا سا رُکا تو دادا جلدی سے بولنے لگا ”ہے بابو جی۔ اندھے فقیر کو۔۔۔“

”نہیں نہیں دادا“ سلطان بولا ”بابو نہیں ہے۔ مداری کا تماشا ہو رہا ہے۔“

”تیرے مدار کی۔۔۔“ گالی کو مکمل کرنے سے پہلے ہی دادا پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ سلطان کے سر پر رکھے ہوئے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر کھانسی کے ایک لمبے چکر میں ڈوب گیا۔

جب تک دادا کی سانس معمول پر آئی، سلطان مداری کی ٹوکری کے نیچے رکھے ہوئے چیتھروں کو سفید براق رنگ کے دو موٹے موٹے کبوتروں میں بدلتا دیکھ چکا تھا۔

دادا نے اپنا بایاں بازو ہوا میں پھیلا کر پوچھا ”کہاں گیا تو؟“

سلطان نے فوراً اپنا سر دادا کے پنجے میں تھما دیا اور وہ پٹری پر چلنے لگے۔

ایک جگہ دادا کی لاٹھی بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی تو کھمبہ بج اٹھا اور سلطان بولا ”دادا! سنا؟ کھمبا کیسا بولا؟“

”ہاں“ دادا رُک گیا اور کھمبے کو ایک بار بجانے کی کوشش کی مگر نشانہ چوک گیا۔ ”کھمبے بولتے ہیں۔ لے ذرا سا بجالے۔“

سلطان نے دادا کی لاٹھی کھمبے پر ماری اور دادا بولا ”دیکھا؟ جب میں تمھاری طرح چھوٹا سا تھا تو دیر تک کھمبوں پر کان رکھے کھڑا رہتا تھا۔ ان دنوں کھمبوں میں میمیں انگریزی بولتی تھیں۔“ پھر دادا نے میموں کی نقل کی۔ ”یُو گُڈ۔ یُو بیڈ۔“

”میمیں بولتی تھیں کھمبوں میں؟“ سلطان حیران رہ گیا۔ ”آج کل کون بولتا ہے دادا؟“ پھر ایک دم سلطان کا لہجہ بدلا اور اس نے سرگوشی میں دادا سے کہا ”دو بابو آ رہے ہیں دادا۔“

دادا جلدی جلدی بولنے لگا ”بابو جی۔ اندھے فقیر کو راہِ مولا ایک روٹی کے پیسے دیتے جاؤ۔ اللہ تمھیں ترقیاں دے۔ اللہ تمھیں بیٹے اور پوتے دے۔“

ایک بابو قہقہہ مار کر بولا ”یہ بڑھا تو خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف پروپیگنڈا کرتا پھرتا ہے۔“ پھر دونوں زور زور سے ہنستے

ہوئے گذر گئے۔

”چلے گئے!“ سلطان نے آہستہ سے کہا پھر ذرا سا رُک کر اس نے بابوؤں کو گالی دے دی۔

دادا نے اپنے بچے کو سلطان کی کھوپڑی پر دبایا۔ ”پھر وہی بک بک۔ کل کیا کہا تھا میں نے؟ کبھی کسی نے سُن لیا تو ادھر کا منہ اُدھر لگا دے گا۔“

سلطان چپ چاپ دادا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا ”میرے سر پر جہاں تمہارا انگوٹھا ہے نا دادا۔ وہاں ذرا سا کھجا دو۔“

دادا نے اپنا انگوٹھا سلطان کی کنپٹی پر زور سے رگڑا۔

”سلطان۔“ خاصی دیر کے بعد دادا بولا۔ ”کیا بات ہے آج تو تم کہیں رکتے ہی نہیں، آج بابو لوگ کہاں چلے گئے؟“

”مر گئے“ سلطان نے جواب دیا۔ پھر یکا یک رُک گیا اور بولا ”آج کون سا دن ہے دادا؟“

”میں کیا جانوں بیٹا۔“ دادا بولا۔ ”تم دن یاد رکھا کرو نا۔ میرے لیے تو دن رات دونوں برابر ہیں۔“ دادا نے ذرا سا

رُک کر سوچا پھر بولا۔

”پرسوں تم مجھے نیلا گنبد کی مسجد میں لے گئے تھے نا؟ پرسوں جمعہ تھا۔ اس حساب سے تو آج اتوار ہے۔ بیڑا غرق ہو اس اتوار کا۔ آج تو بابو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیوی بچوں سے کھیل رہے ہوں گے۔“

سلطان یوں دم بخود کھڑا رہ گیا جیسے کوئی زبردست حادثہ ہو گیا ہے۔ اچانک ٹن کی آواز آئی۔ کسی راہ چلتے نے سلطان کے ہاتھ کے کٹورے میں ایک پیسہ ڈال دیا تھا۔

”کچھ ملا؟ کیا ملا؟“ دادا نے پوچھا۔

”ایک پیسہ ہے۔“ سلطان بولا۔ ”چھوٹے والا۔ نئے والا۔“

دادا نے اپنا بچہ سلطان کے سر پر گھمایا۔ ”جا کوئی چیز لے کر کھالے۔ جا۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔“

”ایک پیسے کا تو کوئی کچھ نہیں دیتا دادا“ سلطان بولا۔ ”دو تین ہو گئے۔ گنڈیری کھاؤں گا۔“

دادا نے سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ ”لے یہ دو نئے پیسے کل کے بچے رکھے ہیں۔ کوئی چیز کھالے۔“

تو نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ بچوں کو تو بڑی بھوک لگتی ہے۔ جا۔“

سلطان نے پیسے لے لیے تو دادا بولا۔ ”جلدی سے آجا۔ اچھا میں یہیں کھڑا ہوں۔ کہاں کھڑا ہوں میں؟“

”ذرا سبائیں کو ہو جا دادا“ سلطان نے دادا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”کھبے کے ساتھ لگ جا۔“ دادا کھبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر وہ کھبے پر کان رکھ کر جیسے کچھ سننے لگا اور مسکرانے لگا۔

یکا یک وہ چونک سا اٹھا اور سلطان کو پکارنے لگا۔ ”سلطان۔ اے سلطان۔“ پھر وہ اُسے گالیاں دینے لگا۔ ”اوسلطان! تو کہاں جا کر مر گیا؟“ کوئی جواب نہ پا کر وہ ادھر ادھر گھوم کر بولا۔ ”اے بھئی، خدا کے بندہ! میرا چھوٹا سا پوتا ادھر کہیں سے پیسے دو پیسے کی کوئی چیز لینے گیا ہے۔ سلطان نام ہے۔ کہیں تانگے موٹر کے نیچے تو نہیں آگیا بد نصیب کی اولاد۔“ پھر وہ چلا دیا۔ ”اوسلطان۔“

”آیا دادا۔“ دور سے سلطان کی آواز آئی۔ مگر زور سے چیخنے کی وجہ سے دادا کے کھانسی چھوٹ گئی۔

دادا کی سانس معمول پر آنے لگی تو اس نے پلٹ کر جیسے کھبے سے پوچھا۔ ”کہاں مر گیا تھا تو؟“

سلطان نے دادا کا بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ ”مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ پیٹ سے گولے نکال رہا تھا۔“

دادا نے اپنے نیچے کو سلطان کی کھوپڑی پر یوں دبایا جیسے اسے اوپر اٹھالے گا۔ ”چل گھر چل۔ وہاں میں تجھے مداری کا تماشا دکھاؤں۔ یہ نہیں سوچا کہ میں اندھا اپنا بیچ یہاں رستے میں کھڑا ہوں۔“

سلطان چپ چاپ چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد دادا نے نرمی سے پوچھا ”کیا کھایا؟“

”گنڈیریاں“ سلطان بولا۔

”ارے بد بخت گنڈیریاں تو پانی ہوتی ہیں۔“ دادا پھر غصے ہونے لگا۔ ”چنے کھا لیتا تو دو پہر تک کا سہارا تو ہو جاتا۔“

سلطان چپ چاپ چلتا رہا۔

”کٹورا ہاتھ میں لٹکا تو نہیں رکھا؟“ دادا نے پوچھا۔

”نہیں دادا“ سلطان بولا۔

”ہاں“ دادا نے نرمی سے نصیحت کی۔ ”اٹھائے رکھا کرو۔ لٹکا رہے تو لوگ سمجھتے ہیں یہ بھکاری نہیں ہیں۔ سودا لینے چلے ہیں۔“

سلطان چپکے لگا۔ ”ایک بار میں کٹورے میں تیل لینے جا رہا تھا تو ایک بابو نے اس میں دوٹی ڈال دی تھی۔ یاد ہے دادا؟“

”ہاں“ دادا بولا۔ ”پراسیا کم ہوتا ہے ایسے بابو کم ہوتے ہیں۔“

”دادا“ سلطان نے کہا۔ ”انگوٹھے والی جگہ کو ایک بار پھر کھجاندے۔“

دادا نے سلطان کی کینٹی پر انگوٹھا زور سے رگڑا اور بولا۔ ”آج واپس جا کر میں زیبوٹی سے کہوں گا کہ میرے نیچے کے سر

سے جوئیں چُن لے۔

تم بھی اس کا کوئی کام کر دینا۔ بالٹی بھر لانا مل سے۔ اچھا؟“

گھر واپس آ کر جب سلطان، دادا کو کھٹولے کے پاس لاتا تو کہتا۔ ”لے دادا بیٹھ جا۔“ دادا لٹھی کو کھٹولے کے پائے سے لگا دیتا اور سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر کھٹولے پر بیٹھ جاتا۔ سر پر سے دادا کا ہاتھ اٹھتے ہی سلطان کو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دم وہ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور اس کے پاؤں میں لوہے کے گولوں کی جگہ ربڑ کے پیسے بندھ گئے ہیں۔ وہ چپکے سے چھپریا میں سے نکل آتا۔ پھر خالہ زیبو کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلتا اور بنگلوں سے گھرے ہوئے میدان میں پہنچ جاتا جہاں امیروں کے بچے کرکٹ کھیلتے تھے اور غریبوں کے بچے انھیں گیندا اٹھا کر دیتے تھے۔ پھر جب وہ میدان خالی کر دیتے تھے تو بیروں، خانساموں اور چراسیوں کے بچے بلور کی گولیاں کھیلتے تھے۔ ایک بار سلطان نے بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی۔ چند روز تک کھیلا بھی تھا۔ مگر پھر ایک دن ایک لڑکے نے انکشاف کیا تھا کہ سلطان تو اندھے بھکاری کا بچہ ہے۔ جب سے اسے کھیل میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ جب کوئی بچہ بلور کی گولی بہت دور پھینک بیٹھتا تو سلطان لپک کر یہ گولی اٹھالاتا تھا اور مالک کے حوالے کرنے سے پہلے اسے چند بار انگلیوں میں گھمالتا تھا۔ ایک بار دادا کے سامنے دیر تک زار زار رو کر اس نے چند پیسے حاصل کر لیے تھے اور اُن سے بلور کی گولیاں خرید لیا تھا۔ مگر جب میدان میں پہنچا اور بچوں نے اس کے ہاتھ میں گولیاں دیکھی تھیں، تو وہ یہ کہہ کر اس پر جھپٹ پڑے تھے کہ یہ تو ہماری گولیاں ہیں۔ وہ اس دن خوب پاؤں پٹخ پٹخ کر رویا تھا۔ مگر دوسرے دن پھر میدان میں جانکا تھا۔

ایک بار میدان میں آنے کے بعد اُسے واپس گھر جانے سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں دادا پھر سے اس کے سر کو اپنے سوکھے ہاتھ میں جکڑ کر اسے سڑک سڑک نہ لیے پھرے۔ اسے معلوم تھا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی اسے دادا کے ساتھ گدا کرنے کے لیے نکل جانا ہوگا۔ اس لیے کھٹولے سے اُٹھتے ہی اُسے ایسا لگتا جیسے اس نے پتھر کی ٹوپی پہن لی ہے۔ دادا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں درد کی پانچ لہریں بن کر اس کی کھوپڑی میں دوڑ جاتیں اور جب دادا نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد لٹھی سنبھالتا اور سلطان کو پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو سلطان آدھا مر جاتا۔ دادا کا یہ ہاتھ سوتے جاگتے ہیں اُسے بھوت کی طرح ڈراتا تھا۔ یہ ہاتھ اسے گرفتار کر لیتا تھا۔ اور وہ پٹری پر یوں چلتا تھا جیسے ملزم ہتھکڑیاں پہنے سپاہی کے ساتھ چلتے ہیں اور پھر قید خانے کے صدر دروازے کے جنگلے میں سے باہر سڑک پر لوگوں کو چلتا پھرتا ہنستا مسکراتا دیکھتے ہیں مگر بس دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ان کی بصارت کے ساتھ سلاخیں صلیبوں کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔

جب دادا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا تو کئی بار اس کا جی چاہا کہ گنڈیری والے کے خوابچے میں

سے جو گنڈیری لڑھک کر گندی نالی کے کنارے جا کر رُک گئی تھی، وہ لپک کر کھالے۔ بابو نے کیلا کھا کر جو چھلکا پھینکا ہے اُسے بڑھ کر اٹھالے اور ذرا سا چاٹ لے۔ مگر جب بھی اس نے کسی بہانے دادا سے ذرا سارک جانے کو کہا تو دادا نے اپنی انگلیاں اس کے سر کی ہڈی میں گاڑ دیں اور بولا ”میں تجھے ٹھلانے نکلا ہوں کہ تو مجھے گدا کرانے نکلا ہے؟ ارے بد بخت! دن بھر میں چار پانچ آنے کی بھیک نہ ملی تو زیو بیٹی دو وقت کی روٹی ہمیں کیا اپنی گرہ سے کھلائے گی؟ اس کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ اس نے ہمارے سر چھپانے کو اپنی چھپر یا دے رکھی ہے؟“

کافی دنوں کی بات ہے دادا بنگلوں سے بھیک مانگنے کے بعد جب کوارٹروں کے پیچھے بیگو کو چوان کے گھر وندے کے سامنے سے گذرا تو اس کی ماں زیو لپک کر آئی اور بولی، ارے بابا۔ دعا کر۔ اللہ میرے بیٹے کی پسلی کا درد ٹھیک کر دے۔ میں تجھے پورا ایک روپیہ دوں گی۔“

دادا نے وہیں کھڑے ہو کر دُعا مانگی تھی پھر چند روز کے بعد اس نے سلطان کو دوبارہ ان ہی بنگلوں کی طرف چلنے کو کہا۔ ابھی وہ بنگلوں تک نہیں پہنچے تھے کہ زیو نے انھیں رستے ہی میں پکڑ لیا۔ دادا کو ایک روپیہ دیا اور بولی ”مجھے بتا تو کہاں رہتا ہے بابا؟ میں جمعات کی جمعات تیری سلامی کو آیا کروں گی۔“ پھر جب اُسے معلوم ہوا تھا کہ یہ دادا پوتا تو کسی دکان کے چھجے تلے پڑ رہتے ہیں تو اس نے بیٹے سے کہہ کر چھپر یا خالی کرادی تھی اور جب سے دونوں وہیں رہتے تھے۔ دن بھر کی بھیک اس کو لادیتے تھے اور وہ اسی حساب سے انھیں روٹی پکا دیتی تھی۔ ان دنوں دادا سے وہ اپنے بیٹے کے اولاد ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

سلطان کو دادا کے علاوہ خالہ زیو بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب بھی دادا کو واپس چھپر یا میں پہنچا کر نکلا تو زیو سے چھپ کر نکلا۔ ورنہ وہ شور مچا دیتی تھی کہ لودیکھو۔ اپنے بوڑھے اپانچ دادا کو اکیلا چھوڑ کر کھیلنے چلا ہے۔

جس روز دادا دن ڈھلے ہی تھک کر واپس آجاتا اور سلطان کو کھسک جانے کا موقع نہ ملتا تو ذرا سا سستا لینے کے بعد وہ پھر سے لاٹھی سنبھال کر کہتا ”چل سلطان۔ چوک کا ایک اور چکر لگوا دے۔ آج کچھ زیادہ مل گیا تو کل تیری چھٹی“۔ مگر یہ چھٹی کبھی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے کہ کچھ زیادہ کبھی نہیں ملتا تھا۔

البتہ اب کچھ عرصے سے یوں ہونے لگا تھا کہ دادا کو آدھی رات کے بعد دمے کے دورے پڑتے اور وہ کھانسن کھانسن اور ہانپ ہانپ کر صبح تک ادھ موہا ہو جاتا۔ اس روز وہ گدا پر نہیں نکلتا تھا۔ مگر سلطان کو جب بھی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ وہ دن بھر بیٹھا دادا کے کندھے اور پسلیاں دباتا رہتا اور اس کے ہاتھ رکتے تو دادا کھانسی سے بھنچی ہوئی آواز میں پکارتا ”کیوں سلطان کیا کر رہا ہے؟ مرنے نہیں گیا؟“

سلطان فوراً دادا کے کندھے پکڑ لیتا اور جی میں کہتا ”اللہ کرے تو خود مر جائے دادا۔ تو مر جائے تو اللہ قسم کیسے مزے آئیں۔ اللہ کرے تو جلدی جلدی سے بس ابھی ابھی مر جائے اور میں بنگلے کی بی بی سے اس کے بچے کی ٹوپی کی بھیک مانگ کر اپنا سر ڈھانپ لوں۔“

پھر ایک روز دادا سچ مچ مر گیا۔ وہ ٹوٹی رات سر کو گھٹنوں پر رکھے کھانستا اور ہانپتا رہا اور اس کی پسلیاں پھٹتی اور سمٹی رہیں۔ سلطان اس کے کندھے دباتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے کناروں کو انگوٹھوں کی پوروں سے سہلاتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ اور جب صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو روتی ہوئی خالہ زیب نے اسے بتایا کہ ”سلطان۔ تیرا دادا تو اللہ کو پیارا ہو گیا۔“

ایکا کی سلطان کے اندر چار طرف پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اور وہ بولا ”سچ؟“ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا کہ دادا لوگ بھی مر سکتے ہیں۔ پھر بیگو کو چوان آس پاس کے لوگوں کو جمع کر لایا اور وہ دادا کو غسل دے کر دفنانے لے گئے۔

خالہ زیب وقفے وقفے سے روتی رہی اور اس کی بہو نے بھی سلطان کو بڑے پیار سے دن بھر اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ بیگو بھی قبرستان سے واپس آیا تو سلطان کے لیے گنڈیریاں لیتا آیا اور گنڈیریاں چوستے ہوئے سلطان نے سوچا۔ جب دادا مر جاتے ہیں تو کیسے مزے آتے ہیں۔

رات بھی خالہ زیب نے اسے چھپریا میں نہ جانے دیا کہ بچہ ہے، ڈر جائے گا۔ صبح کو اس نے سلطان کو رات کی ایک چپاتی اور لسی کا ایک پیالہ دیا۔ خوب پیٹ بھر کر وہ اٹھا تو زیب نے پوچھا۔ ”کہاں چلے بیٹا؟“

سلطان کو یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔ ہم کہیں بھی جائیں، تمہیں کیا۔ ہمارا دادا تو مر گیا ہے۔

سلطان کو خاموش پا کر وہ بولی ”نہیں بیٹا۔ کھیتے ویلتے نہیں ہیں۔“ پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چھپریا میں لے آئی اور کٹورا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی ”آج کہیں سے آٹھ دس آنے کمالا.... میں تجھے چاول کھلاؤں گی۔ جا بیٹا۔ کسی آباد سڑک کا ایک پھیرا لگا لے۔ اللہ تیرا ساتھی ہو۔“

سلطان نے ہاتھ میں کٹورا لے لیا مگر چھپریا سے باہر آتے ہی وہ رک گیا۔ واپس چھپریا میں گھسا جیسے کچھ بھول آیا ہے۔ پھر وہ بلبلا کر رو دیا اور خالہ زیب کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے کترا کر بھاگ نکلا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا جب اس نے سڑک پر ایک بابو کے سامنے کٹورا پھیلایا۔ ”بابو جی اندھے فقیر کو راہ مولا ایک روٹی۔“ اس نے زار زار روتے ہوئے دادا کے الفاظ دہرا دیے۔

”کیا تو اندھا ہے؟“ بابو نے سختی سے پوچھا۔

سلطان کو یکا یک اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گھبرا کر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”جھوٹ بھی بکتا ہے اور روتا بھی ہے؟“

بابو نے ڈانٹا۔ ”نو کری کرے گا؟“ اس نے پوچھا پھر سلطان کو مسلسل روتا پا کر جانے لگا۔ سلطان زندگی ہوئی آواز میں بولا ”ہے بابو جی۔ راہِ مولا پیسے دو پیسے دیتے جاؤ۔“ بابو پلٹے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ کافی دور نکل گیا تھا جب روتا ہوا سلطان یکا یک اس کی طرف دوڑنے لگا اور پکارنے لگا ”بابو جی۔ ہے بابو جی۔“

بابو رک گیا۔ اس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بھی ٹھٹھک گئے۔ ”نو کری کرے گا؟“ بابو نے پوچھا۔ ”بابو جی۔“ ہانپتا ہوا سلطان بابو کے پاس رکا۔ پھر اس کا نچلا ہونٹ ذرا سا لٹکا اور وہ بولا۔ ”بابو جی۔۔ دیکھیے۔۔ میں نو کری نہیں مانگتا۔ بھیک نہیں مانگتا۔“ اس نے کٹورا زمین پر پٹخ دیا۔

”تو پھر مجھے کیوں پکارا؟“ بابو نے جمع ہوتے ہوئے لوگوں پر ایک نظر دوڑا کر ذرا تلخی سے پوچھا۔ ایک دم سلطان کی آنکھوں میں اکٹھے بہت سے آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے بولا ”بابو جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ خدا آپ کو بہت بہت دے۔ کیا آپ ذرا دور تک میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چل سکیں گے؟“ ”لو اور سنو۔“ بابو احمقوں کی طرح ہجوم کو دیکھنے لگا۔

— احمد ندیم قاسمی

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- سلطان کو زیو خالہ کا باہر جانے پر ٹوکنا کیوں برا لگتا ہے؟
- 2- سلطان کو دادا کا ہاتھ لوہے کی ٹوپی جیسا کیوں لگتا تھا اور بعد میں اس کے نہ ہونے پر اسے کیا محسوس ہوا؟
- 3- سلطان نے بابو جی سے اپنے سر کے اوپر ہاتھ رکھ کر تھوڑی دور چلنے کی درخواست کیوں کی؟